38

68

اسی دنیا میں جنت حاصل کرنے کی کوشش کرو

(فرمودہ ۲۳- ستمبر ۱۹۳۲ء بمقام ڈلہوزی)

تشہد، تعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

انسان کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو حقیقی مقام تجویز کیا ہے وہ جنت کا مقام ہے- لیکن عام طور پر اکثر لوگ جنت کی حقیقت سے ناواقف اور جاہل ہوتے ہیں- بلکہ اس وقت تو اسلام کے سوا دنیا کے تمام مذاہب اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ جنت مرنے کے بعد حاصل ہونے والی کوئی چیز ہے- گو اسلام نے اس کی پُرزور تردید کی ہے تاہم مسلمانوں میں سے بھی بعض اس عقیدہ کے ہو گئے ہیں کہ جنت مرنے کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے- اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان پر ماحول کا اثر ہوتا ہے اور مسلمانوں کے چاروں طرف چونکہ اس خیال کے لوگ تھے اس لئے ان میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو گئے جن کا خیال ہے کہ جنت کا اس دنیا کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں مرنے کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے حالانکہ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لئے جو جنت اور دوزخ تجویز کی گئی ہے وہ اسے اسی دنیا میں ملنی شروع ہو جاتی ہے اور دوسرے جہان میں جنت وہی حاصل کر سکیں گے جو اسے یہاں لے چکے ہوں گے- اسی طرح جنہیں اس دنیا میں دوزخ نصیب ہوتی ہے وہ اگلے جہاں میں بھی دوزخ ہی میں جائیں گے- چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى[1] جنت اور دوزخ کے متعلق اس دنیا اور اگلے جہان کے تعلق نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت سے لوگ اکثر فوائد سے محروم رہ جاتے ہیں اور کئی رنگ میں نقصان اٹھا لیتے ہیں- جنت یا دوزخ ان کے بالکل قریب ہوتی ہے لیکن وہ اسے دیکھ نہیں رہے ہوتے- ان کی مثال بالکل اس اندھے کی سی ہوتی ہے جس کے سامنے روپیہ پڑا ہو لیکن وہ اسے نہ

دیکھتے ہوئے چھوڑ کر ایک پیسہ مانگنے کے لئے آگے چلا جائے۔ یا اس کے راستہ میں نقصان دہ یا مضرّت رساں کوئی چیز ہو لیکن وہ اس سے بچنے کی کوشش نہ کرے۔ اسی طرح کئی انسان ایسے ہوتے ہیں کہ جنت یا دوزخ ان کے پاس ہی ہوتی ہے لیکن اپنی ناواقفیت کے سبب وہ اسے مرنے کے بعد ملنے والی چیز سمجھتے ہیں حالانکہ اگلے جہان کی جنت اس جہان کی جنت سے مختلف نہیں۔ وہاں اور یہاں کی جنت ایک ہی ہے، صرف شکل اور صورت میں فرق ہو گا۔

اس دنیا میں انسان کی جنت اس کے دل میں ہے لیکن وہاں یہی دل کی جنت متمثل ہو کر باہر آجائے گی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ مؤمن کے لئے یہ انعام ہے کہ اس کو ایسی جنت دی جائے گی جو زمین و آسمان کے برابر ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ایک شخص کو اتنی جنت مل جائے گی تو باقی لوگ کہاں جائیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مؤمن کی یہ جزاء ہے کہ اسے زمین و آسمان سے بھی زیادہ وسعت رکھنے والی جنت ملے گی۔ قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ [1] غرض ایسی جنت جس کی چوڑائی زمین و آسمان کے برابر ہو۔ پھر اس کے ساتھ ایسی تقسیم ہو جو ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ ملے، وہ یقیناً ایک قابلِ اعتراض چیز ہے۔ لیکن جنت کے متعلق حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے احساسات کے مطابق بدلہ مل جائے گا۔ جنت ایک ہی ہو گی سب اسی میں ہوں گے لیکن ہر شخص یہی سمجھ رہا ہو گا کہ یہ میری ہی ہے اور میں ہی اکیلا اس کا مالک ہوں کیونکہ جنت میں اگر دوئی کی صورت ہو تو پھر خواہش باقی رہتی ہے اور ہر شخص یہ خیال کر کے کہ دوسرے کی جنت ممکن ہے میری جنت سے اعلیٰ ہو، یہ آرزو اور تمنا کرنے لگ جائے کہ یہ مجھے مل جائے اور اگر یہ خواہش پیدا ہو جائے تو پھر تقسیم کیونکر ہو گی۔

غرض جنت ایک ایسا مقام ہے جس کے متعلق ہر شخص یہ سمجھ رہا ہو گا کہ یہ میرا ہی ہے۔ وہ مقام زید کا بھی ہو گا اور زید سمجھ رہا ہو گا کہ یہ صرف میرا ہی ہے۔ وہ عمرو کا بھی ہو گا اور عمرو سمجھ رہا ہو گا اس کا صرف میں ہی مالک ہوں۔ وہی مقام خالد کا بھی ہو گا اور وہ خیال کرے گا کہ اس پر صرف میرا ہی قبضہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہو گی کہ سب کے سب ایک ہی جنت کے متعلق کہہ رہے ہوں گے۔ ہاں ہر شخص اپنی قابلیت اور استعداد کے مطابق نفع حاصل کرتا رہے گا۔

میں بتلا چکا ہوں کہ جنت اس دنیا میں بھی ہے اور دوسری دنیا میں بھی۔ لیکن اگلی دنیا میں صرف انہی لوگوں کو ملے گی جو اسے اس دنیا میں حاصل کر چکے ہوں گے۔ مگر کئی انسان ہیں جو اسے مرنے

کے بعد حاصل ہونے والی چیز سمجھ کر مرنے کے بعد اسے تلاش کرلینے کی امید رکھتے ہیں' اس وجہ سے محروم رہ جاتے ہیں۔ایسے لوگوں کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جو سمندر میں ڈوب رہا ہو۔اس کے بالکل پاس ہی ایسی رسّی ہو جسے پکڑ کر وہ بچ سکتا ہے لیکن وہ اس پاس کی رسی کو تو نہ دیکھے اور دس پندرہ گز کے فاصلہ پر پہنچ کر رسّی کی تلاش کرنا چاہے۔ایسا شخص یقیناً بچ نہیں سکے گا اور انجام کار ڈوب جائے گا مگر اس کا ڈوبنا اس وجہ سے نہیں ہوگا کہ نجات کا سامان اور ذریعہ اس کے پاس نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ باوجود سامان ہونے کے اس نے اس کو اس کی اصل اور حقیقی جگہ میں تلاش نہ کیا۔بالکل اسی طرح اس شخص کی حالت ہوتی ہے کہ جنت تو بالکل اس کے قریب ہوتی ہے لیکن وہ اسے دور سمجھ کر وہاں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح بسا اوقات اس سے محروم رہ جاتا ہے۔جنت کے باوجود قریب ہونے کے اسے دور سمجھ لینے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایسے لوگ اعمال حسنہ کو اور چیز سمجھتے ہیں اور ان کے بدلہ کو دوسری چیز۔لیکن قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے کہ اعمال اور ان کی جزاء ایک ہی چیز ہے۔اگر یہ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہوں تو بالکل ممکن ہے کہ بعض اوقات اعمال تو ہوں لیکن جزاء نہ ملے۔یا جزاء تو مل جائے اور اعمال موجود نہ ہوں۔لیکن اگر اعمال اور ان کی جزاء ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ایک کی موجودگی ضرور دوسرے کے وجود کا باعث ہوتی ہے اور دوسرا اپنے وجود کے لئے ضرور پہلے کی موجودگی چاہتا ہے۔

پس ہمیشہ اس بات کو مدنظر رکھو کہ انسان کے قلب کی نیکی ہی اس کی جنت ہے اور انسان کے قلب کی بدی ہی اس کے لئے دوزخ۔اور اگلے جہان میں یہی قلبی کیفیتیں متمثل ہو جائیں گی۔ جوں جوں انسان اپنے قلب کو لڑائیوں جھگڑوں بدیوں اور خرابیوں سے پاک کرتا چلا جاتا ہے' اس کی جنت اس کے قریب آتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔اور جتنا جتنا اس کا دل نیکیوں' خوبیوں بھلائیوں اور اخلاق فاضلہ سے دور ہوتا جاتا ہے' دوزخ کو اپنے قریب لاتا جاتا ہے حتیٰ کہ خود دوزخ میں گر جاتا ہے۔دور جانے کی ضرورت نہیں ایک گاؤں کو ہی لے لو جس میں دس بیس گھر ہوں۔یا چار پانچ ہی ہوں بلکہ میں تو کہتا ہوں دو تین گھروں کا گاؤں ہو۔ میدانی علاقہ میں تو کوئی ایسا گاؤں ہوتا نہیں شاید پہاڑوں میں مل جائے۔اس میں رہنے والے کوئی سے دو آدمی لے لو جو ایک جیسے گھر' ایک جیسی آب و ہوا' ایک ہی ماحول' ایک ہی قسم کی خوراک' ایک ہی طرح کے لباس میں زندگی بسر کرنے والے ہوں۔ان سے پوچھو تمہاری کیا

حالت ہے۔ ایک کہے گا اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل اور احسان ہے' بالکل آرام سے ہوں کوئی تکلیف نہیں' بڑے سکھ اور چین سے دن گزر رہے ہیں' اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ لیکن دوسرے کا جواب اس سے بالکل مختلف ہو گا۔ وہ کہے گا حال کیا پوچھ رہے ہو۔ مر رہا ہوں' کوئی سکھ نہیں' مصیبت ہی مصیبت ہے' کوئی دن چین سے نہیں کٹتا' دوزخ میں پڑا ہوں' ایک دن بھی تو آرام کا نہیں ملتا۔ بتلاؤ یہ فرق کہاں سے آیا؟ کپڑوں سے' چھت سے' مکان کی دیواروں سے' آب و ہوا سے' خوراک سے' زمین و آسمان سے' سورج یا چاند سے' روپیہ پیسہ سے نہیں ان چیزوں سے فرق نہیں پڑ سکتا کیونکہ دونوں کو یہ سب ایک جیسی حاصل ہیں۔ جس قسم کا مکان میں پہلا رہتا ہے ایسا ہی دوسرے کا مکان ہے جس ہوا میں پہلا سانس لیتا ہے اسی میں دوسرا بھی اپنے دن گزار رہا ہے۔ جو پہلا خوراک کھاتا ہے وہی دوسرے کی بھی ہے۔ جس زمین پر پہلا چلتا پھرتا ہے اسی پر دوسرے کے قدم پڑتے ہیں۔ جو سورج چاند پہلے کے لئے ہے وہی دوسرے کو ملا ہوا ہے۔ جو پہلے کی آمد ہے وہی دوسرے کی ہے۔ غرض جو جو آسائشیں پہلے کو میسر ہیں دوسرا بھی انہی سے متمتع ہو رہا ہے۔ ان چیزوں کی وجہ سے تو دونوں کے جوابات میں فرق نہیں ہو سکتا۔ آخر یہ فرق کہاں سے پیدا ہوا۔ اس کے متعلق یاد رکھو' یہ احساسات کا فرق دل سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک نوعیت کے حالات میں رہ کر ایک کا دل آرام و راحت محسوس کر رہا ہوتا ہے لیکن اسی قسم کے حالات میں دوسرا مصیبت و تکلیف کا احساس کر رہا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک بیمار اور تندرست میں فرق ہے۔ ایک بیمار خواہ کتنی ہی مزیدار چیز چکھے اسے خراب' پھیکی' بدمزہ' کسیلی اور بدذائقہ ہی قرار دے گا۔ وہی چیز ایک دوسرے کے نزدیک نہایت اعلیٰ اور مزیدار ہو گی۔ اس وقت حقیقت معلوم کرنے کے لئے یہی کریں گے کہ اس چیز کو کئی شخصوں کے سامنے رکھیں گے۔ اگر ان میں سے سب یا اکثر یہ کہہ دیں یہ اچھی اور ذائقہ دار ہے تو اسے اچھا سمجھا جائے گا۔ اور بدذائقہ کہنے والے کو ہم بیمار کہیں گے۔ غرض یہ ظاہری مزے کا فرق بھی انسان کے اندر ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

دنیا میں جو لوگ تکلیف محسوس کرتے ہیں اس کا بسا اوقات یہ سبب ہوتا ہے کہ وہ پیش آنے والے واقعات کے متعلق اپنے دل میں ایک معیار قائم کر لیتے ہیں۔ لیکن جب اس معیار کے مطابق اپنے وقت پر معاملہ وقوع پذیر نہیں ہوتا تو وہ تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً کسی شخص کے متعلق یہ خیال کر لینا کہ اسے میرے ساتھ ایسا سلوک کرنا چاہئے لیکن جب ان کی منشاء کے مطابق سلوک نہیں ہو گا تو ناراضگی پیدا ہو گی اور تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ اس طرح لوگ اپنے لئے

آپ تکلیف کا سامان تیار کر لیتے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں مدرسہ کی انجمن کی طرف سے حضرت خلیفہ اول غالباً صدر رہتے۔ کوئی کام ایک دوست کے سپرد کیا گیا۔ غالباً کوئی حساب کا ہی معاملہ تھا۔ بعد میں جب ان سے حساب طلب کیا گیا اور کہا گیا کہ آمد و خرچ کا حساب دیجئے تو وہ سخت ناراض ہوئے اور کہنے لگے میں مسلمان ہوں، اتنی بدظنی مجھ پر کیوں کی جاتی ہے۔ آخر میں کچھ کھاتو نہیں گیا کہ مجھ سے حساب طلب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حساب میں کوئی خلاف قاعدہ اور خلاف قانون بات نہیں بلکہ ایسی چیز ہے جس کے بغیر دنیا کا کام نہیں چل سکتا۔ حتیٰ کہ قرآن مجید میں تو آتا ہے کہ انبیاء سے بھی حساب لیا جائے گا۔ لیکن انہوں نے اپنے ذہن میں خیال کر لیا کہ حساب طلب کرنا بہت بُری بات ہے اور جو مجھ سے حساب طلب کیا گیا ہے، ضرور اس کی وجہ یہی ہے کہ مجھ پر بدظنی کی گئی ہے اس خیال کی وجہ سے انہیں تکلیف پہنچی حالانکہ یہ کوئی تکلیف دہ بات نہ تھی لیکن ایک ایسا شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ حساب لینا کوئی بُری بات نہیں بلکہ ضروری چیز ہے اس سے جب حساب طلب کیا جائے گا اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اور نہایت خوشی سے وہ حساب دیدے گا بلکہ اگر اس سے حساب نہیں لیا جائے گا تو اسے تکلیف ہوگی۔ غرض دیکھ لو ایک ہی بات ہے مگر ایک شخص کے لئے حساب کا دینا دوزخ ہے، دوسرے کے لئے حساب کا نہ دینا دوزخ۔ اسے دوزخ ہی کہا جائے گا کہ دکھ اٹھا رہے ہیں، تکلیف محسوس کر رہے ہیں، دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ پھر یہی چیز ہم آئے دن دوستوں کی مجالس میں دیکھ سکتے ہیں۔ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ دو دوست ایک بات سنتے ہیں۔ ان میں سے ایک جب دوسرے موقع پر اسے بیان کرتا ہے تو کسی مقام پر دوسرا یہ کہہ دیتا ہے کہ میرا تو یہ خیال نہیں، میں نے تو یہ نہیں سمجھا۔ اس پر اگر دوسرا یہ خیال کرے کہ اس نے مجھے جھٹلایا ہے اور مجھے کذاب سمجھا ہے، اور ناراض ہو۔ یا دل ہی دل میں کُڑھے تو یہ اس کی حماقت ہوگی کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ دوسرے کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ یا واقعی اس نے گفتگو کا وہ حصہ سنا ہی نہ ہو۔ بیسیوں توجیہیں ہو سکتی ہیں لیکن اگر کوئی سمجھے کہ مجھے جھوٹا قرار دیا گیا ہے تو گویا وہ خود اپنے لئے دوزخ تیار کرتا ہے۔ غرض انسان کے لئے جنت و دوزخ پیدا کرنا خود اس کے اختیار میں ہوتا ہے۔ چاہے تو وہ اپنے لئے دوزخ پیدا کرے اور چاہے تو جنت۔ جنت کے حاصل کرنے کے لئے قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ قربانیاں کرنے والے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ بہتیرے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قربانیاں تو کرتے نہیں، البتہ

قربانیاں بنالیا کرتے ہیں- حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک واقعہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ ایک آدمی نے کسی شخص کی دعوت کی- اور اپنی طاقت کے مطابق اس کی تواضع میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی- جب مہمان جانے لگا تو اس سے معذرت کرنے لگا کہ میری بیوی بیمار تھی- کچھ اور بھی مجبوریاں بتلائیں اس لئے آپ کی پوری طرح خدمت نہیں کرسکا امید ہے آپ درگزر فرمائیں گے- یہ سن کر مہمان کہنے لگا میں جانتا ہوں تم کس غرض سے کہہ رہے ہو تمہارا منشاء یہ ہے کہ میں تمہاری تعریف کروں اور تمہارا احسان مانوں لیکن تم مجھ سے یہ امید نہ رکھو بلکہ تمہیں میرا احسان ماننا چاہئے- میزبان نے کہا نہیں میرا ہرگز یہ منشاء نہیں- میں واقعی شرمسار ہوں کہ پوری طرح آپ کی خدمت نہیں کرسکا- اگر آپ کا مجھ پر کوئی احسان ہے تو وہ بھی فرمادیجئے- میں اس کا بھی شکریہ ادا کردوں- اس پر مہمان نے کہا تم خواہ کچھ کہو، میں تمہارے دل کی منشاء کو خوب جانتا ہوں لیکن یادرکھو تم نے تو مجھے کھانا ہی کھلایا ہے- میرا تم پر بہت بڑا احسان ہے- تم ذرا اپنے کمرہ کو دیکھو کئی ہزار کا سامان اس میں پڑا ہے- جب تم میرے لئے کھانا لینے اندر گئے تھے میں چاہتا تو دیا سلائی دکھا کر یہ سب کچھ جلادیتا- تم ہی بتلاؤ ایک پیسہ کا بھی سامان باقی رہ جاتا- مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیا میرا یہ احسان کم ہے- یہ سن کر میزبان نے کہا واقعی آپ نے بہت بڑا احسان کیا میں اس کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں- دیکھ لو ایک انسان ایسا بھی ہوتا ہے کہ بجائے محسن کا احسان پہچاننے اور اس کا شکریہ ادا کرنے کے یہ سمجھتا ہے کہ میں احسان کر رہا ہوں- خیر یہ تو ایک قصہ ہے مگر اس قسم کی مثال اسلامی تاریخ سے بھی ملتی ہے- مکہ والوں کی انتہائی اذیتیں برداشت کرنے کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے اور مدینہ والوں نے آپ کو جگہ دی تو اس وجہ سے بعض منافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنا احسان جتاتے اور کہتے کہ دیکھو جب تمہارے وطن والوں نے تم کو نکال دیا تو ہم نے اپنے پاس جگہ دی- حتیٰ کہ ایک موقع پر ناراض ہو کر رئیس المنافقین نے یہاں تک کہہ دیا لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ [۳] اگر ہم مدینہ واپس پہنچے تو وہاں کا سب سے معزز آدمی (عبداللہ بن ابی بن سلول) وہاں کے سب سے ذلیل فرد (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ تھا) کو وہاں سے نکال دے گا- حالانکہ جگہ دینے والے یہ منافق نہیں تھے بلکہ اور لوگ تھے اور وہ ایسی باتوں سے بہت بالا تھے بلکہ جب مکہ فتح ہوگیا اور دشمن تباہ و برباد ہوگئے تو بعض لوگوں کو طبعاً یہ خیال پیدا ہوا کہ مکہ اب اپنے قبضہ میں آچکا ہے، کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصل وطن واپس نہ تشریف لے جائیں- اس خیال سے ہی انکی کمریں

ٹوٹ گئیں۔ اور وہ سخت پریشان ہو گئے۔ اگر وہ لوگ اپنا احسان جتانے والے ہوتے تو خود جا کر کہتے کہ حضرت ہم نے آپ کو اس وقت جگہ دی جبکہ آپ کے لئے کہیں جگہ نہ تھی' آپ کے لئے ہم نے اب تک تکلیفیں اٹھائیں' اب آپ کا گھر آپ کے قبضہ میں آچکا ہے آپ وہاں تشریف لے جائیے۔ لیکن ایسی گفتگو کرنے کی بجائے وہ اس خیال سے ہی پریشان ہو جاتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ مدینہ کو چھوڑ کر مکہ چلے جانے کا ارادہ نہ فرمالیں اور اضطراب کی حالت میں پوچھتے ہیں حضور مکہ میں ہی تشریف تو نہیں رکھیں گے۔ اس پر جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا نہیں میرا گھر مدینہ میں ہے' میں مدینہ میں ہی جاؤں گا۔ یہاں نہیں رہوں گا[۳] ۔ تب انہیں اطمینان آتا ہے غرض جو قربانی کرنے والے تھے انہیں تو یہ خیال تھا کہ ہم پر یہ احسان ہوا ہے کہ رسول اللہ ہمارے پاس ٹھہرے اور واقعی یہ بہت بڑا احسان الٰہی تھا کہ اتنے عظیم الشان نبی کی مہمانی کا انہیں شرف بخشا گیا۔ ورنہ اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنے رسول کے قیام کے لئے سینکڑوں اسباب پیدا کر دیتا۔ لیکن جنہوں نے کوئی قربانی نہیں کی تھی' وہ احسان جتا رہے تھے۔ گویا گھر کو آگ لگانے والے کی مثال عبداللہ بن ابی بن سلول کی مثال تھی۔ پھر کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تھوڑی سی قربانی کر کے اسے بہت بڑھا لینا چاہتے ہیں۔ چندے بھیجتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے بہت بڑا کام کیا۔ حالانکہ وہ نہیں دیکھتے کہ اتنے بڑے بڑے کام کیا ان کے ہی چندے سے ہو رہے ہیں۔ ایسے لوگ بجائے اس کے کہ ممنون احسان ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خدمت دین کا موقع عطا فرمایا' اُلٹا اپنا احسان جتلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر کئی ایسے ہیں جو بڑی قربانیاں کرتے ہیں لیکن پھر مَنّ وَاَذٰی کے ذریعہ انہیں ضائع کر دیتے ہیں ایسے لوگ بھی جنت میں نہیں ہوتے بلکہ دوزخ میں پڑے رہتے ہیں۔ کیونکہ کام کرنے کے باوجود اس کے بدلہ سے محروم رہتے ہیں۔ دیکھو بعض لوگ تھے جنہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں بڑی بڑی قربانیاں کیں لیکن پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اپنی قربانیوں پر انہیں ناز شروع ہو گیا۔ ان کے بدلہ و عوض میں قوم کی سرداری اور لیڈری کے خواہشمند ہوئے اور اس طرح خدا کے غضب کے نیچے آگئے۔ ان کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جس نے ایک باغ لگایا اس کو سینچا' اس کی خبر گیری کی مگر جب وہ باغ پھل دینے کے قابل ہوا تو بجائے اس کا پھل کھانے کے انہوں نے اس کی لکڑیوں کو جمع کر کے انہیں باغ کے گرد پھیلا کر آگ لگادی۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ اس کے پھل سے محروم رہے بلکہ اس باغ کو بھی جلانے کی کوشش کی جس کی ایک وقت بڑی محنت اور جانفشانی سے انہوں نے

آبیاری کی تھی۔ بعض اور لوگ ہیں جنہیں ہر قسم کی قربانیاں کرنے کی توفیق ملتی ہے۔ باوجود اس کے وہ اور خواہش کرتے ہیں کہ انہیں قربانی کا موقع ملے۔ یہی لوگ حقیقی جنت میں ہوتے ہیں کیونکہ ان کا دل ہمیشہ خدا تعالیٰ کی رضاء سے خوش ہوتا رہتا ہے۔ اور کوئی تکلیف انہیں غمگین نہیں کر سکتی۔

ایک اور بات بھی یاد رکھنی چاہئے اور وہ یہ کہ اچھے اعمال کے نتیجہ میں جنت ملتی ہے اور قلبی راحت کا نام ہی جنت ہے۔ پس اگر کسی کو اپنے اعمال کے نتیجہ میں سرور نہیں حاصل ہوتا، خوشی نہیں ملتی، آرام محسوس نہیں ہوتا تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی قربانی ضائع گئی۔ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں اور آپ کے بعد صحابہ کی بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں جن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انکے نزدیک قربانی کا مفہوم ہی اور تھا۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے لیکن اشارتاً ایسی احادیث وسیَر کی کتابوں کے مطالعہ سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ [۵] صحابہ میں سے بعض تو اپنا فرض ادا کر چکے ہیں اور بعض اس کے انتظار میں ہیں۔ جب جنگ بدر ہوئی تو بہت سے صحابہ اس میں شامل نہیں ہوئے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ رسول کریم ﷺ نے اس جنگ کا اظہار نہیں کیا تھا حالانکہ آپ کو الہام ہو چکا تھا۔ بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ روانگی سے پہلے آپ کو علم نہیں تھا۔ بلکہ راستہ میں الہام کے ذریعہ علم دیا گیا۔ پہلے آپ کا صرف یہی خیال تھا کہ یہ صرف دھمکی ہے اور باقاعدہ جنگ کا ارادہ نہیں تھا۔ غرض اس جنگ میں سب صحابہ شریک نہ ہو سکے۔ لیکن جنگ کے بعد جب آنحضرت ﷺ واپس تشریف لائے تو جو صحابہ نہیں گئے تھے انہیں اپنے محروم رہ جانے کا افسوس ہوا۔ ان میں سے ایک صحابی کے متعلق حدیثوں میں آتا ہے کہ وہ ایک مجلس میں بیٹھے تھے۔ جس میں جنگ بدر کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی اور شاملین جنگ کے کارنامے بیان ہو رہے تھے۔ کچھ دیر تو وہ صحابی خاموش رہے آخر کہنے لگے تم نے کچھ بھی نہیں کیا میں ہوتا تو دشمن کے دانت کھٹے کر دیتا۔ بظاہر یہ تکبر کا فقرہ تھا اور اس قسم کا دعویٰ سے بسا اوقات کہنے والے کے دل کو زنگ لگ جاتا ہے لیکن اس وقت انہوں نے پورے اخلاص سے یہ کہا اور معلوم ہوتا ہے کہ عقیدت واخلاص سے ان کا دل اس قدر لبریز اور بھرا ہوا تھا کہ ان کے لئے ایسا کہنا جائز ہو گیا تھا۔ آخر انہی صحابی کو جب جنگ احد میں شامل ہونے کا موقع ملا تو اس جنگ کی اس گھبراہٹ والی گھڑی میں جب کہ بہت سے جری اور بہادر دل توڑ رہے تھے۔ وہ صحابی حضرت عمرؓ کے پاس

سے گزرے جو اس وقت اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں لئے بیٹھے تھے۔ انہوں نے پوچھا عمر کیا ہوا حضرت عمرؓ نے کہا اور کیا ہونا ہے رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے۔ یہ سن کر ان صحابی نے جو اس وقت ہاتھ میں لئے کھجوریں کھا رہے تھے کہا پھر یہ رونے کا کون سا موقع ہے جہاں رسول اللہ ﷺ گئے ہیں وہیں ہمیں بھی جانا چاہئے اور کہا میرے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان یہی کھجوریں حائل ہیں نا۔ اسی وقت باقی کھجوریں پھینک دیں اور تلوار لے کر دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔ اور نہایت شجاعت و مردانگی سے تلوار چلاتے رہے حتیٰ کہ ان کا ایک ہاتھ بے کار ہو گیا تو دوسرے میں تلوار پکڑ لی۔ اور برابر دشمن پر وار کرتے رہے آخر وہ شہید ہو گئے۔ جنگ کے بعد جب ان کی لاش کو دیکھا گیا تو اس پر ستر زخم پائے گئے [۵]۔ یہ قربانی ایسی ہے کہ جس سے پتہ لگتا ہے کہ اس کے کرنے والے کو یہ احساس ہی نہیں تھا کہ میں کوئی قربانی کر رہا ہوں۔ اس وقت اس صحابی کو یہ خیال نہ آیا کہ یہ قربانی کا موقع ہے۔ اپنی جان کی قربانی دے دوں بلکہ یہ خیال پیدا ہوا کہ آنحضرت ﷺ ہم میں نہیں ہیں اس دنیا سے چلے گئے ہیں۔ ہمیں بھی آپ کے پاس پہنچ جانا چاہئے۔ اسی طرح ایک دوسرے صحابی کے متعلق آتا ہے وہ مدینہ کے رئیس تھے وہ ایک جنگ میں شریک ہوئے۔ ایک دوسرے صحابی بیان کرتے ہیں کہ اثنائے جنگ میں میں ان کے پاس سے گزرا تو دیکھا کہ ان کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں۔ زخموں سے نڈھال ہو رہے تھے اور یہی معلوم ہوتا تھا کہ چند منٹ کے مہمان ہیں۔ وہ صحابی بیان کرتے ہیں میں نے ان سے دریافت کیا آپ کا کیا حال ہے وہ کہنے لگے مجھے یہ بتاؤ رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے۔ میں نے کہا بخیریت ہیں۔ وہ صحابی کہتے ہیں پھر میں نے ان سے کہا اس وقت میں آپ کی اور تو کوئی خدمت نہیں کر سکتا ہاں اگر بیوی بچوں یا دوسرے رشتہ داروں کو کوئی پیغام دینا ہو تو بتا دیں میں پہنچا دوں گا۔ وہ کہنے لگے کہ میرے رشتہ داروں کو میری طرف سے کہہ دینا کہ مجھے تو رسول کریم ﷺ کی خدمت کا موقع نہیں ملا۔ لیکن یاد رکھو کہ رسول اللہ ﷺ ایک امانت ہیں اور میں یہ امانت اب تمہارے سپرد کرتا ہوں اپنی جانوں سے بڑھ کر ان کی حفاظت کرنا یہ کہہ کر انہوں نے جان دیدی۔ [۶] غرض یہ لوگ اس قسم کا نمونہ دنیا میں چھوڑ گئے ہیں جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ انسان کس طرح اسی دنیا میں جنت حاصل کر سکتا ہے۔ ایسے آدمی بیمار بھی ہوتے ہیں، انہیں دکھ درد بھی پہنچتا ہے، دنیاوی نقصان بھی ہوتے ہیں، لیکن ان بے حقیقت اور معمولی باتوں سے وہ اندوہ گیں نہیں ہوتے بلکہ وہی باتیں جو دوسروں کے لئے مصیبتیں ہوتی ہیں ان کے لئے سکھ کا باعث ہو جاتی ہیں۔

احد کی جنگ کے ذکر ہی میں ایک اور صحابی کے متعلق آتا ہے کہ تیروں کی بوچھاڑ دیکھ کر انہوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے تاکہ آپ کو کوئی تیر نہ لگ جائے۔ تیروں کے سامنے اپنے ہاتھ رکھنے کی وجہ سے آپ کا ہاتھ شل ہو گیا۔ لیکن انہوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے سے اپنا ہاتھ ہٹا لینا گوارا نہ کیا[8]۔ ایک دوسرے صحابی کے متعلق مذکور ہے کہ وہ اپنی کمر تیروں کی طرف کئے رہے اور اُف تک نہ کی۔ حالانکہ تیر پر تیر پڑ رہے تھے۔ جنگ کے بعد کسی نے ان سے دریافت کیا۔ دریافت کرنے والے غالباً ان کے بیٹے تھے کہ کیا آپ کو اس وقت تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ انہوں نے کہا تکلیف تو ہوتی تھی لیکن میں اس خیال سے اُف بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مبادا اس طرح میری کمر ہل جائے اور آنحضرت ﷺ تک کوئی تیر پہنچ جائے[9]۔

اس قسم کی مثالیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور پائی جاتی رہی ہیں۔ مثلاً افغانستان کے شہیدوں کو ہی لے لو۔ ان میں سے قریباً ہر ایک کو موقع دیا گیا کہ وہ احمدیت چھوڑ کر اپنے آپ کو اس مصیبت سے بچالے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک نے انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا میں اپنے دین سے نہیں پھر سکتا۔ صاحبزادہ عبداللطیف صاحب کے متعلق ایک غیر مذہب اور غیر ملک کا یعنی ایک اٹیلین لکھتا ہے کہ وہ اس وقت بھی جبکہ ان پر پتھر پڑ رہے تھے بڑے الحاح وزاری سے دعائیں مانگ رہے تھے کہ اے اللہ تعالیٰ! ان لوگوں کو معاف کر دے کہ یہ ناواقفیت کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں۔ ایک اور شخص نے نعمت اللہ خان صاحب کے متعلق بیان کیا کہ انہوں نے زندگی کے آخری لمحے دعا کرتے ہوئے گزارے۔ دنیا داروں کی نگاہ میں انہیں پتھر پڑ رہے تھے لیکن ان کا دل یہ محسوس کر رہا تھا کہ گویا پھول گر رہے ہیں۔ غرض جس وقت انسان کے دل کے اندر حقیقی ایمان پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے لئے دنیاوی تکلیفیں ہی نہیں رہتیں اور جب انسان تکلیف میں نہ رہے تو یہی جنت ہے۔

دنیا میں ہر انسان نے ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، ضرور اسے جان دینی ہے۔ آج تک دنیا میں کوئی ہمیشہ نہیں رہا اور نہ آئندہ رہے گا۔ لیکن کیا ہی مبارک ہے وہ وجود جو دین کے لئے اپنی جان دیتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا میں بھی اس کا نام باقی رہتا ہے اور کہا جاتا ہے فلاں وہ ہے جس نے کسی خاص ذاتی غرض کے لئے نہیں بلکہ اپنے ایمان کی حفاظت میں اپنی جان دیدی۔ اور اللہ تعالیٰ کے حضور جو اس کے لئے انعامات ہیں ان کی تو کوئی

انتہاء ہی نہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ بے شک مرنا تو ہر ایک کو ہے لیکن جنگ میں یعنی جہاد کے لئے نکلے تو انسان نوجوانی میں ہی مرجاتا ہے۔ میں کہتا ہوں مرجاتا ہے تو پھر کیا ہوا۔ درحقیقت اس کے لئے مرنا ہی زندگی ہے۔ لیکن یہ بھی غلط ہے کہ نوجوانی کی موت کا سبب صرف جنگ ہی ہے بلکہ اگر بیماری کی وجہ سے مرنے والوں کے اعداد و شمار پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ نوے فیصدی مرنے والے وہ ہوتے ہیں جو جوانی کی موت مرتے اور اس دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ غرض جب موت سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا اور کسی نہ کسی بہانہ سے اس دنیا سے کوچ کر جاتا ہے تو کیوں نہ انسان عزت کی موت کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو۔ اسی طرح مال و دولت کا حال ہے۔ اس میں نقصان ہوتا رہتا ہے' چور لے جاتے ہیں۔ گھر میں کوئی بیمار ہو جائے تو ڈاکٹروں اور دوائیوں پر بہت سا روپیہ اٹھ جاتا ہے۔ لیکن اگر اس مال کو دین کی راہ میں خرچ کیا جائے تو برضاء و رغبت دین کے لئے مالی قربانیاں کی جائیں تو نتیجتاً انسان بہت زیادہ نفع میں رہتا ہے۔

پرسوں ہی ایک دوست کا خط آیا۔ میں نے دیکھا کہ خط بہت ہی اخلاص سے لکھا ہوا تھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں آپ کہتے ہیں بشاشت سے چندے دو۔ ہمیں وہ روحانی بشاشت کہاں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جب کہ ہمیں پہلے کھانے کے لئے مل جاتا ہے پھر چندے دیتے ہیں۔ چندہ تو ان کا ہے جن کے پاس کھانے کو بھی نہیں ہوتا لیکن وہ چندے بھیجتے ہیں۔ اصل بشاشت بھی انہی کو حاصل ہے۔ مجھے ہمیشہ ایک واقعہ یاد رہتا ہے۔ منشی اروڑہ صاحب جنہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے بعد مستقل طور پر قادیان میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے دو یا تین پاؤنڈ دیئے اور کہا کہ اماں جان کو دے دینا اس کے ساتھ ہی رو پڑے۔ یہ واقعہ حضرت صاحب کی وفات کے بعد کا ہے۔ میں نے خیال کیا کہ شاید حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کی یاد سے رو رہے ہیں۔ آخر جب دیر تک روتے رہے اور ان کی ہچکی بندھ گئی تو میں نے روکنے کے لئے کہا۔ آپ روتے کیوں ہیں؟ کہنے لگے جب میں نے بیعت کی میں چھ یا سات روپیہ کا نوکر تھا۔ اس کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے چندہ کی تحریک کی۔ اس وقت اپنی اسی تنخواہ میں سے بچا کر جب قادیان آتا تو وہ تھوڑی سی رقم ساتھ لے آتا تا وہ دین کی راہ میں خرچ ہو۔ لیکن میری خواہش ہمیشہ یہ ہوتی کہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں سونے کی مُہریں پیش کروں۔ اسی مقصد کے لئے میں اپنی تنخواہ میں سے بچاتا رہتا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ مُہریں بننے کی مقدار کا ہو بہت دیر ہو جاتی اور میں وہی روپے لے کر قادیان میں

آجاتا۔ اس طرح مجھے اپنی خواہش پوری کرنے کا کبھی موقع میسر نہ آیا۔ اب میں اس قابل ہوا کہ مُہریں پیش کروں' اس وقت ان کی تنخواہ اسی پچاسی کے قریب تھی' تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فوت ہوگئے ہیں۔ غرض ایک وہ لوگ ہوتے ہیں جو قربانی کرتے ہی نہیں یا معمولی قربانی کرکے شکوہ سنج ہوتے ہیں۔ اور ایک ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ اعلیٰ قربانیاں کرکے بھی یہ شکوہ ہوتا ہے کہ قربانی کا موقع نہیں ملا۔ یا جو ملا ہے وہ بہت کم ہے۔ غرض یہ لوگ قربانیاں کرتے اور اسی میں راحت محسوس کرتے ہیں۔ اسی میں ان کو سرور اور لطف حاصل ہوتا ہے۔ اور میرے نزدیک یہی چیز ہے جس کا نام جنت ہے۔ بتلاؤ وہ شخص بھی کبھی تکلیف میں ہو سکتا ہے جس کا کوئی مالی نقصان ہو' جسے کوئی بدنی تکلیف پہنچے' جس کے رشتہ داروں میں سے کوئی فوت ہو جائے لیکن وہ ان سب مواقع پر صبر کرے۔ اور دلی یقین سے یہ سمجھے کہ خدا کی چیز تھی اسی نے لے لی۔ ایسے شخص کو رنج دلانے والی کون سی چیز ہو سکتی ہے۔ عبداللہ بن مظعون سے آنحضرت ﷺ کو بہت پیار تھا۔ جب آپ کا بچہ ابراہیم فوت ہوا تو اس وقت آپ نے فرمایا جاؤ عبداللہ بن مظعون کے پاس۔ ان کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ جب انہیں اسلام کی وجہ سے کفار کی طرف سے بہت تکلیفیں دی گئیں تو وہ ہجرت کر گئے۔ راستہ میں انہیں ابن یعلیل ملے۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ عبداللہ کفار کی مصیبتوں کی وجہ سے مکہ چھوڑ رہے ہیں۔ تو چونکہ پرانے تعلقات تھے انہوں نے کہا تم ہجرت نہ کرو۔ میں تمہیں اپنی حفاظت میں لیتا ہوں۔ پھر تمہیں کوئی تنگ نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ اس وعدہ پر وہ انہیں واپس لے آئے۔ جب عبداللہ بن مظعون واپس مکہ پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ دوسرے مسلمان بھائی کفار کی طرف سے سخت تکالیف میں ہیں۔ لیکن انہیں ابن یعلیل کی حفاظت میں ہونے کی وجہ سے کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر وہ برداشت نہ کر سکے اور ابن یعلیل سے جاکر کہہ دیا یہ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا کہ میرے دوسرے مسلمان بھائیوں کو تو مصیبتیں آئیں اور میں مزے سے پھرتا رہوں۔ یہ کہہ کر اس کی ضمان واپس کر دی۔ تواریخ میں آتا ہے اس کے بعد وہ ایک مجلس میں پہنچے جہاں ایک مشہور شاعر اپنا کلام سنا رہا تھا یہ شاعر بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔ شاعر نے پڑھا

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ

اس کی آنحضرت ﷺ نے بھی تعریف فرمائی ہے۔ جب عبداللہ بن مظعون نے یہ سنا تو کہنے لگے ٹھیک کہا ٹھیک کہا۔ شاعر بہت بڑے پائے کا تھا۔ اس کو ایک بچہ کی تعریف بھی ناگوار گزری اور

اس نے مجلس کو مخاطب کر کے کہا تمہارے شہر کے لونڈوں کو کوئی تمیز نہیں کہ وہ سرِ مجلس بڑوں کی ہتک کرتے ہیں۔ اس پر لوگوں نے عبداللہ بن مظعون کو برابھلا کہہ کر چپ کرا دیا اور شاعر سے معذرت کی۔ پھر اس نے پڑھا

وَكُلُّ نَعِيْمٍ لَا مَحَالَةَ زَائِلٌ

یعنی ہر نعمت بہرحال محو اور زائل ہو جائے گی۔ عبداللہ بن مظعون نے کہا یہ درست نہیں۔ جنت کی نعمتیں ضائع نہیں ہوں گی۔ پہلے تو ایک نوعمر کے منہ سے شاعر کو اپنی تعریف بھی گراں گزری تھی۔ مذمت سن کر تو وہ برداشت نہ کر سکا اور کہہ اٹھا ایسے بدتمیزوں کی مجلس میں میں اب اپنا کلام نہیں سناؤں گا۔ شاعر کی ناراضگی نے مجلس میں بھی جوش و غصہ کی لہر پیدا کر دی اور کسی شخص نے مُکّا مار کر عبداللہ کی ایک آنکھ نکال دی۔ اس وقت ابن یعلیل نے کہا دیکھا! میں نہ کہتا تھا میری حفاظت سے باہر نہ نکلو میری پناہ چھوڑی تو یہ حال ہوا کہ اپنی آنکھ نکلوالی۔ عبداللہ نے کہا تمہاری پناہ کیسی میری تو دوسرے آنکھ بھی دین کی راہ میں اسی بات کا انتظار کر رہی ہے [۱۰]۔ اب دیکھو آنکھ کا نکلنا ایک دنیادار کی نگاہ میں مصیبت اور تکلیف کا موجب ہے لیکن ایک دیندار کے نزدیک اسی میں راحت ہے۔ پھر انسان اولاد کو باعث راحت سمجھتا ہے لیکن اسے کیا معلوم کہ وہی اولاد اس کے لئے کل دکھ اور وبال کا موجب ہو جائے گی۔ ابوجہل کے ماں باپ نے اس کی پیدائش پر کتنی خوشیاں منائی ہوں گی لیکن اس کے اعمال کو معلوم کر کے اس کے باپ کو جو شاید جنت میں ہی ہو کیونکہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے فوت ہو چکا تھا کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔ اور اس کی ماں کی کتنی زبردست خواہش ہوگی کہ کاش میں ایسا بچہ نہ جنتی۔ یا پیدائش کے بعد اسے زندہ درگور کر دیتی۔ دنیا کی دوسری چیزوں کا بھی یہی حال ہے۔ اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے متعلق یقینی طور پر انسان کہہ سکے کہ یہ میرے لئے سکھ کا موجب ہے۔ ہاں حقیقی قربانی ایک ایسی چیز ہے جو حقیقی مسرت دلا سکتی ہے اور حقیقی جنت یہی ہے کہ انسان اس بات کو سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قربانی کرنے سے ہی آرام اور سرور حاصل ہو سکتا ہے۔ اور پھر یہ سمجھنے کے بعد اس پر عمل پیرا بھی ہو جائے۔ اس کے خلاف کا نام دوزخ ہے۔ اور یہ جنت اور دوزخ بنانا انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ جو شخص اپنے لئے جنت پیدا نہیں کرتا وہ خود اپنا نقصان کرتا ہے۔ اور جتنا کوئی دنیا سے محبت کرے گا اور ورلی زندگی کی زیبائشوں کو اپنے لئے وجہ مسرت بنائے گا اتنا ہی وہ اپنے لئے دوزخ تیار کرے گا۔ کیونکہ جب کوئی رشتہ دار فوت ہو گا اس کے لئے دوزخ بیوی بچوں کو

بیماری یا تکلیف ہوگی اس کے لئے دوزخ مال کا نقصان ہوگا تو اس کے لئے دوزخ غرض ہر دنیاوی نقصان دوزخ کا سامان ہوگا۔ لیکن جو شخص خدا کے لئے آپ ان چیزوں کی قربانی کے لئے تیار ہوگا اس کے لئے کوئی تکلیف نہیں۔ اس کا مال ضائع ہوگا تو وہ یہی کہے گا خدا نے دیا تھا اسی نے لے لیا۔ ورنہ میں تو خود اسے دینے کے لئے تیار تھا۔ لڑکی یا لڑکا فوت ہوگا کسی رشتہ دار کو تکلیف ہوگی۔ غرض ہر دنیاوی نقصان پر اس کے منہ سے یہی نکلے گا۔ اور وہ ہر آن جنت میں ہوگا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مبارک احمد سے بہت محبت تھی۔ جب مبارک احمد بیمار ہوا تو دوائی وغیرہ میں ہی پلایا کرتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آخری وقت میں حضرت مولوی صاحب جو بڑے حوصلہ اور قوی دل کے انسان تھے اور سخت سے سخت گھبراہٹ کے موقعوں پر بھی گھبرایا نہیں کرتے تھے وہ بھی گھبرا گئے۔ انہوں نے نبض پر ہاتھ رکھا تو چھوٹ چکی تھی۔ انہوں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا حضور کستوری لائیے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام چابی لے کر قفل کھول ہی رہے تھے کہ مبارک فوت ہوگیا یہ دیکھ کر حضرت مولوی صاحب یکدم گر گئے۔ میں نے دیکھا وہ سخت گھبراہٹ میں تھے۔ انہیں زیادہ خیال یہ تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو مبارک احمد سے بہت محبت تھی۔ اس کی وفات کی وجہ سے انہیں شدید صدمہ ہوگا۔ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب یہ سنا کہ مبارک فوت ہوگیا ہے تو آپ کاغذ قلم دوات لے کر بیٹھ گئے اور چند خط لکھ کر دیئے کہ ڈاک میں ڈال دو۔ ان خطوں میں مضمون یہ تھا کہ مبارک احمد فوت ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کی دین تھی اس نے لے لی۔ رنج و فکر کی کوئی بات نہیں۔ اللہ کی رضاء پر راضی رہنا چاہئے۔ غرض دوسروں کو صبر کی تلقین کے خطوط اس وقت روانہ کئے اور یہاں کے لوگوں کو فرمایا بے شک مبارک احمد سے ہمیں بہت محبت تھی لیکن اس لئے ہمیں محبت تھی کہ ہمیں خیال تھا بعض الہامات اس کی ذات سے پورے ہونے والے ہیں۔ غرض ایسے لوگوں کو کوئی تکلیف جسے دنیا تکلیف کہتی ہے کبھی ہوتی ہی نہیں۔ پس دنیاوی نقصانات پر غمگین ہونا دنیا کی تکالیف پر دلگیر اور اندوہ گیں ہونا دنیا کی دوزخ ہے۔ لیکن خدا کی رضا پر راضی رہنا' دنیا کی تکالیف پر صبر کرنا' خدا کی راہ میں جان و مال غرض کہ ہر چیز کی برضاء و رغبت قربانی کرنا دنیا کی جنت ہے۔ یہ ایسی جنت ہے جو ہر شخص کے قبضہ میں ہے جو چاہے لے لے اور جو چاہے اسے رد کر کے اس دنیا اور اگلے جہان کی جنت سے محروم ہو جائے۔ کیونکہ وہاں کی جنت کی ابتداء یہیں سے ہوتی ہے اور وہ جنت یہیں سے شروع ہو جاتی ہے۔ اگلے جہان میں اسے وہی شخص حاصل کر سکے گا جو اسی دنیا میں

لے چکا ہے۔ جو لوگ مرنے کے بعد جنت کو تلاش کرنے کا خیال کرتے ہیں ان پر تو یہی مثل صادق آتی ہے کہ "لڑکا بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں" انسان کے اپنے ہی دل میں جنت و دوزخ ہوتی ہے لیکن وہ اسے کہیں دوسری جگہ خیال کرتا ہے اور محروم رہ جاتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ اسے اپنے دل میں تلاش کرے تو کامیاب ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ہماری جماعت کو قرآن مجید کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے صرف لفاظی کوئی چیز نہیں۔ قرآن کے مغز کو سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔

(الفضل ۱۸۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء)

---

۱ بنی اسرآئیل: ۷۳

۲ اٰل عمران: ۱۳۴

۳ المنٰفقون: ۹

۴ سیرت ابن ہشام ذکر فتح مکہ

۵ الاحزاب: ۲۴

۶ بخاری کتاب الجہاد باب قول اللہ عز و جل من المؤمنین رجال......

۷ اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ جلد ۳ صفحہ ۲۷۷ مطبوعۃ بیروت ۱۳۷۷ھ

۸ اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ جلد ۲ صفحہ ۲۷۷ مطبوعۃ بیروت ۱۳۷۷ھ

۹ اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ ذکر حضرت طلحہ

۱۰ سیرت ابن ہشام القسم الاول ذکر قصۃ عثمان ابن مظعون فی رد جوار الولید